آپ بیتی

خُودنوِشت سوانح حیات

جو جیل کی کال کوٹھڑی سے برآمد ہُوئے

از

اشفاق اُللہ خاں حسرت وارثی

خاندانی حالات

میں شاہجہان میں پٹھانوں کے اُس خاندان میں پیدا ہوا تھا جو
قدن خیل کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ میری نانہال خلیل حافظ خیل کے نام سے مشہور
ہے یہ دونوں خاندان اپنی شرافت اور کھرے پن میں مشہور رہیں ان دونوں میں باہم
شادی بیاہ ہوا کرتا ہے میری دادھیال یعنی قدن خیل گورنمنٹ کی نظر میں باعزت
نہیں ہے خواہ پہلے کبھی رہی ہو مگر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ان کا کوئی رسوخ
نہیں رہا۔ میں نے سینٹرل جیل لکھنؤ میں ایک کتاب جو مجھے اتفاقاً مل گئی تھی پڑھی
جس کا شروع تھا نہ آخر تھا کہ میں اس کا نام لکھتا مگر ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا
کہ میری نانہال اور دادھیال کے کیا کیا کارنامے ہیں۔ اب میں پہلے دادھیال
کا ہی ذکر کروں گا ابتدا میں جب میرا خاندان شاہجہان پور میں آباد ہوا یہاں
کی اعلی بستی گوجروں سے آباد تھی جو مسلمانوں کے تحت و تصرف میں آئی تمام
قرب و جوار کے مواضعات پر یہاں کے دیگر افغانان کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح
ہمارے خاندان کے لوگوں کو بھی مواضعات مل گئے اور وہ یہاں چین سے رہنے
بسنے لگے لیکن نہ انہوں نے ترقی ہی کی کوشش کی اور نہ نام و نمود کی خواہش

بے فکر اور آرام طلب بنے رہے غرضیکہ آج یہ حال ہے کہ ایک بھی گریجویٹ پیدا نہ کر سکے نہ تو مالی حالت ہی سُدھاری اور نہ ترقی کی علم سے اُن کو نفرت اور ہاتھ پیر ہلانے سے اُن کو دشمنی اور انگریزی پڑھنے کو تو بہت بڑا کفر سمجھا گئے خدا خدا کرکے چند ایسے افراد پیدا ہوئے خدا اُن کو جنت میں جگہ دے کہ جنہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا مگر ابھی وہ بُرے جراثیم چند خاندانی افراد میں موجود تھے جو اپنے بچوں کو انگریزی سے محروم رکھنے کو جنت کی کنجی سمجھتے تھے وہ ان کے پیچھے اِس بُری طرح پڑے کہ خُدا کی پناہ۔ غرض کہ کثرت کی ہمیشہ فتح اور قلت کی شکست ہوتی ہے یہ غریب بھی ان کا نشانہ بن گئے اور انٹرنس بھی پاس نہ کر سکے چنانچہ اِسی دور سے مجھے بھی گذرنا پڑا مجھے نہایت افسوس ہوتا ہے جب میں اپنی تعلیم کی طرف غور کرتا ہوں اِس میں میں ہی خطاوار ہوں میرے سرپرست بالکل نہیں کیونکہ وہ غریب طریقہ تعلیم سے قطعی ناآشنا تھے جب میں بڑا اور ہٹا کٹا پہلوان ہوگیا اُس وقت انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا خیر خُدا کا شکر ہے کہ اُردو فارسی پڑھا دی گئی تھی جس کی بدولت آج میں اُردو ہی میں اپنی مختصر زندگی لکھ رہا ہوں اور اگر سچ پوچھئے تو وہی پرانا روّیہ تعلیم کا ابتک ہمارے یہاں چلا آ رہا ہے۔ مولوی صاحب بیس تیس لڑکوں کو لئے اردو فارسی کی تعلیم دے رہے ہیں اور ڈنڈا برسا رہے ہیں مگر اب یہ طریقہ بھی زمانے کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے اور اب مولوی صاحب بیچارے [illegible] ہو [illegible] اب یا تو مدرس صاحب ہیں یا ماسٹر صاحب اب تو لوگوں کو انگریزی

تعلیم کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔ مثل مشہور ہے کہ اندھوں میں کانے راجہ"
خاندان بھر سے تار وغیرہ مجھ سے پڑھوائے جاتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی اولاد
بھی اپنے اُسی قدیم رویے پر چل رہی ہے جس کا مجھے غم ہے مگر ہاں اس کے بعد کی
نسل اُمید افزا حالت میں پرورش پا رہی ہے جو اُمیدوں کا ماوا و ملجا ہے
پُرانے لوگ جس طرح اپنی مالی حالت اور خاندانی امتیازات دریا بُرد کر چکے ہیں اسی
طرح اپنی طاقت و قوت اور جوش و خروش کو بھی الوداع کہہ چکے ہیں۔ ان لوگوں
کا محض تقدیر پر شاکر رہنا اور گذشتہ افسانے دُہرانا ہی بس ایک کام رہ گیا
ہے مجھے پھر اُسی کتاب کا حوالہ دینا پڑتا ہے کہ جس طرح غدر سے پہلے اور اجداد کو
میرے خاندان میں اُجّنہ کے بارے میں تذکرہ گوئی ہوا کرتی تھی ویسے ہی میرے
زمانہ تک بھی اور رہی اب بھی ہے۔ یہ لوگ قسمت پر اتنا بھروسہ کئے ہوئے ہیں
کہ دُنیاوی امور میں کوشش کرنا بھی گناہِ عظیم سمجھتے ہیں اس کا مجھے اتنا دُکھ ہے کہ
میں بیان نہیں کر سکتا اور میں قوی اُمید رکھتا ہوں کہ اب موجودہ نسل اور آئندہ کی
نسل اپنے کو فخرِ خاندان بنائے گی اور ترقی کی اعلیٰ معراج پر پہنچنے کی کوشش کرے گی
اگر میں زندہ رہوں گا تو مجھے ورنہ میری رُوح کو خوشی ہوگی۔ مگر اِن جہاں سب
برائیاں اِن میں ہیں وہاں اِن کی اسپرٹ قابلِ تعریف ہے گو کہ بعض گھروں میں
پست ہمتی اور اپنے کو ناکارہ سمجھنا اِن کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ میری رگوں میں
وہ خون تھا جو مجھے آج پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کرائے ہوئے ہے اور میں اِسے پھر

خوش ہوں بعض اوقات مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں ایسے خاندان سے تعلق رکھنے والا
کیسے نکلا یہ تو میرے باپ کے خاندان کے حالات ہیں جن پر مجھ کو کہنا پڑتا ہے
کہ خدایا ان کو دیدۂ بینا دے اور اولادوں کو جب تک اُن کے بزرگ عیش
عشرت اور سستی و کاہلی کے دیوتا کو پوجتے رہیں نافرمان بنائے رکھ تاکہ کچھ اپنا،
وطن کا اور قوم کا بھلا کر سکیں ۔

نانہال :۔ میری نانہال یعنی میری ماں کے خاندان کے حالات اچھے ہیں۔
غدر کے قبل سے اس وقت تک سرکاری عہدوں پر چلے آتے ہیں اور غدر کے بعد
سے تو سرکار کی ناک کا بال ہو گئے۔ میری ماں کے دادا اور اُن کے بھائی سب جج اور
کلکٹر تھے جب غدر شروع ہوا تو اُنہوں نے مُلک کا ساتھ نہ دیا اور نہ نواب صاحب
کا ساتھ دیا بلکہ جاسوسی کا کام کیا اور جیسا کہ مجھے کتاب سے معلوم ہوا اور جو کچھ
بھی میں نے سُنا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے اب شرم نہیں آتی ہاں کیس سے قبل اگر مجھے
ضرورت محسوس ہوتی تو ہرگز بھی نہ لکھتا کیونکہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس کو
باعثِ صد ننگ سمجھتا ہوں کہ جب ملک کے لوگوں کو احساسِ آزادی پیدا ہو
اور وہ اپنا خون مثل پانی کے بہائیں، اپنے بچوں کی قربانی قربانگاہِ وطن پر چڑھائیں،
اپنی دولت، آبرو، مکان غرض کہ ہر شے خوشی کے ساتھ آزادی اور محض
آزادیٔ مذہب کے لئے نثار کر دیں اُن کے ساتھ فریب کرنا اُن کے خلاف سازش
کرنا ان کی اسکیموں کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرنا اور وطن دشمنوں کی امداد کرنا

اگر شرم اور ہزار شرم کی بات نہیں تو اور کیا ہے مجھے زمانۂ طالب علمی اپنے چند دوستوں سے ہمیشہ ذلت اُٹھانی پڑی جب وہ مجھ سے یہ کہتے تھے کہ تم خائنینِ وطن کی اولاد ہو میں اُن احباب کا نام نہیں لکھنا چاہتا کیونکہ انہیں اب شرم آئے گی کہ وہ اس وقت اپنے گلے میں غلامی کا پٹّہ ڈالے ہوئے ہیں یا سرکاری کچہریوں میں کنجڑا بنوں کی طرح بازار دم میں دوکان لگائے بیٹھے ہیں اُس وقت اُن کو فخر تھا کہ اُن کے آباء و اجداد اُس گروہ کے ایک بڑے رکن تھے جس نے آزادی کا عَلَم بلند کیا تھا۔ خیر میں نے اپنی قربانی سے اُس دھبّے کو جو ۱۹۵۷ء میں میرے ننھیال کے بزرگوں نے عصمتِ وطن پر لگائے تھے اپنے نوجوان معصوم خون سے دھو ڈالا کیا اس خاندان کا اس کو کفّارہ سمجھا جا سکتا ہے خواہ یہ ہو یا نہ ہو۔ میری آنے والی نسل پر یہ اعتراض نہ ہوگا کہ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو خائن تھا بلکہ میری قربانی پر لوگ رحم فرمائیں گے اور ان کو اشفاق کے خاندان کا ایک ممبر خیال کر کے بزرگوں کی غلطیاں پھر از سرِ نو یاد نہ کریں گے مجھے ننھیال کے خاندان کے بارے میں بس اتنا ہی لکھنا ہے۔ اب مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ خاندان ترقّی کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا کیونکہ آجکل کے نوجوان ترقی کرنے کے بجائے اپنے بزرگوں پر ہی ناز کرنے کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور یہی سمّ قاتل ہے کہ بزرگوں کی تعریف میں لگے رہیں یا اُن پر فخر کرتے رہیں۔ انسان کو بذاتِ خود امتیازی حیثیت حاصل کرنی چاہیئے بزرگوں پر فخر و مباہات کی ضرورت نہیں — یوں میں دادا کی طرف سے قوم پرست اور ننھیال کی طرف

سے انگریز پرست پیدا ہوا اس لئے وطنی آزادی کا جذبہ ہی طاقت ور رہا اور وطن پیارے وطن کے لئے آج موت کے تختے پر کھڑا ہوں۔

عہدِ طفلی اور تعلیم و تربیت

میری ماں خاندان حافظ خلیل خیل کی ایک ممبر تھیں اُن کے والد کورٹ انسپکٹر پولیس تھے اور اُن کے دادا سب جج تھے جو ایّام غدر میں آزادی کے پجاریوں کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ میری ماں کی تعلیمی حالت اچھی خاصی تھی اور نہایت عاقل و زیرک تھیں اُنہوں نے ہم لوگوں کو اچھی تربیت بہم پہنچائی آج ہم جوان ہونے پر بھی چاروں بھائی اُن سے اسقدر ڈرتے ہیں کہ اُن کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

میرے والد صاحب انسپکٹر پولیس تھے مگر خدا کے فضل سے میرے پیدا ہونے سے قبل ہی مستعفی ہو چکے تھے اور گو کہ وہ میری کم عمری ہی میں اس دُنیا سے گذر گئے خدا اُنہیں غریق رحمت کرے اور ان کے کارناموں کو جو ایّام ملازمت میں کیے تھے فراموش اور نظر انداز کر دے جن کے وہ ہمیشہ معافی خواہ رہے۔ وہ مجھے پولیس کے کارنامے بطور قصّے کے سُنایا کرتے تھے جو مجھے اکثر ابھی تک یاد ہیں اور پھر اُن کا سامنا بھی کیا اور وہ سبق جو محض سماعت پر موقوف تھا عملی صورت میں ملنے لگا قبلہ والد صاحب بھی والدہ کی مرضی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ہم چار بھائی اور ایک بہن اُن کی اولاد میں ہیں۔ میں اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اور آخری اولاد ہوں میرے علاوہ سب بھائی بہن شادی شدہ ہیں۔ والد صاحب نے ایّام

ملازمت میں بہت روپیہ کمایا اور بڑے نیز منجھلے بھائی کی تعلیم و تربیت پر بہت کچھ خرچ کیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا بس وہ شہروں کے محض نام انگریزی میں لکھ لیتے ہیں اور پڑھ بھی لیتے ہیں اور وہ ویسے ہی ہیں جیسے خاندان تدن خیل کے اور لوگ میرے منجھلے بھائی اُردو مڈل پاس ہیں اور انگریزی اُنہوں نے ساتواں درجہ پاس کر کے چھوڑ دی اُن پر ہمارے خاندانی بزرگوں کی کرم فرمائی زیادہ رہی اُن کی حالت واقعی ایسی تھی کہ وہ کسی قابل ہو جاتے مگر بھلا ہو اُن انگریزی زبان کے دشمنوں کا جو انگریزی کتاب کو ہاتھ لگانا ہاتھ کا نجس ہونا سمجھتے تھے۔ ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ ہمارے ایک عزیز اپنی انگریزی کتاب اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے یہاں اتفاقاً بھول آئے جب اُنہوں نے وہ کتاب وہاں رکھی ہوئی دیکھی تو اُنہوں نے ایک ملازم سے وہ کتاب چمٹے سے پکڑوا کر علیحدہ ایک طرف رکھوا دی۔ اگر وہ سائنس سے واقف ہوتے تو یہ جان کر کہ دھات (Conductor) ہے ہرگز چمٹے سے نہ پکڑواتے بلکہ اُسے لکڑی سے علیحدہ کراتے۔

جب میں بچہ تھا ایک مولوی صاحب قبلہ خدا اُنہیں غرقِ رحمت کرے میرے بھائیوں کو پڑھایا کرتے تھے مجھے بھی اُن کے پاس پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا۔ میں ذہین تھا اسلئے رسم بسم اللہ کی باقاعدہ تقریب سے پیشتر ہی میں نے تین ابتدائی کتابیں پڑھ لیں اور پھر اس طرح رسم بسم اللہ منائے جانے کی نوبت ہی پیش نہ آئی۔ مولوی صاحب نے پُرانے طریقہ پر تعلیم شروع کی تھی اور رفتہ رفتہ اُردو کتابوں کے ساتھ

ساتھ مجھے فارسی کی "اخلاقِ محسنی" اور "انوارِ سہیلی" پڑھا دیں میرے گھر میں والدہ کی اُردو کتابوں کا ذخیرہ بہت زیادہ تھا مولوی صاحب لاہور کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھاتے تھے اِن کے علاوہ فاضل اوقات میں میں نے قصّے کہانیوں جیسے شاہنامہ طلسم ہوش رُبا وغیرہ بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں البتہ جنگ کے حالات پڑھنے سے مجھے بہت دلچسپی تھی یہ دلچسپی جب عملی شکل اختیار کرلیتی تھی تو مولوی صاحب مجھے کان پکڑ کر اُٹھایا بٹھایا کرتے تھے کبھی تو سزا مگر کسرت کا کام دیتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں خاندانی بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو زمین جھنکا دیتا تھا محلّے میں بھی جنگ آزمائی ہوتی رہتی کیونکہ میں ایک جنگجو لڑکا تھا غرض مارپیٹ کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا جب یہاں تک نوبت پہنچی تو میرے لئے یہ سزا تجویز کیگئی کہ فرصت ہی نہ دی جائے جو شرارت کرے چنانچہ مولوی صاحب کے ساتھ دوپہر کو جانا اور پھر شام کو مغرب کے وقت تک ساتھ رہنا جب مغرب کی نماز پڑھ کر مولوی صاحب واپس گھر جائیں اس وقت مجھے چھٹی ملے۔ جیسا کہ آج عالم ہے کہ پھانسی کی کوٹھڑی ہے اور ہم اس میں بند ہیں۔ باہر خواہ کیسا ہی تماشا ہو ہم نہ باہر نکل سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں یہی حال اُس وقت تھا کہ باہر لڑکوں کے کھیلنے کی آوازیں سُنا کرتے دِل مسوس کر رہ جاتے سبق پڑھاتے وقت مولوی صاحب مجھ سے خوش رہتے تھے مگر شرارت کے وقت اور زیادہ خوش کر سینکڑوں بیٹھکیں لگواتے تھے گویا مولوی صاحب مجھے پہلوان بنانے

کا شوق رکھتے تھے۔ ہمارے مولوی صاحب کا طریق تعلیم نرالا تھا۔ اِن کی لیاقت ذاتی میں کوئی شک نہیں علم ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے مگر ہم ایسے بدقسمت کہ ریاضی میں ہمیشہ کمزور رہے۔ وہ سبق کم دیتے تھے مگر انگریزی تعلیم کا خاکہ بہت اُڑاتے تھے اور انگریزوں کی دوستی کو جہنم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انگریزی پوشاک سے سخت نفرت تھی اور ایسے ایسے قصے بنا بنا کر سنایا کرتے تھے کہ جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہوئے آج بھی جھجکتے ہیں گو کہ اب اس وقت کے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنستے ہیں مگر اب پتہ چلتا ہے کہ جب پیارے مہاتما گاندھی جی نے بھی وہی تعلیم دی کہ دیسی وضع رکھو اور دیسی کپڑا پہنو پیارے مولوی صاحب کی باتیں یاد آئیں۔

anti British sentiment اُن میں انتہا سے زیادہ تھی چنانچہ اُس وقت کے گروپ میں سے ہم صرف دو موجود ہیں جو اُمیدوں کے موافق نکلے گو کہ ایک بہت آگے نکل گیا اگر وہ آج زندہ ہوتے تو خوش ہوتے یعنی اُن کی مرضی کے مطابق اُن کو ملتا کیونکہ بدیسی خیالات مجھ میں کچھ نہیں اور انگریزوں کے خلاف اسپرٹ بھی ہے مگر سید حبیب احمد anti British تو ہیں مگر کوٹ پتلون کے دلدادہ ضرور ہیں اور یہ اُن کی پرانی عادت ہو چکی ہے اور وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ خیر۔ اُن کو اُن کے مقاصد میں خدا کامیاب کرے ایک اور بھی اُن کے شاگرد تھے مسٹر ایم احمد صبر جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور اس طرح ہم

ہیں ان کی رُوح کو خوش کرتے رہتے ہیں۔ غرض کہ نہ اب وہ مولوی صاحب ہیں اور نہ وہ زمانہ۔ پھانسی کی کوٹھڑی ہے اور ہم۔

جب میں جوان ہوا تو بدقسمتی سے ۱۴ برس کا خاصا جوان معلوم ہوتا تھا اور پھانسی بھی مجھے موٹا تازہ ہونے کے باعث دی جائے گی اور یہ بات Prosicuter کے بحث میں آئی۔ خیر انگریزی زبان پڑھ کر جب کہ ریاضی بالکل صفر تھی اسکول میں جا داخل ہوا۔ اب جیسے ہی انگریزی شروع کی تو خاندانی لوگوں میں عجیب قسم کے جراثیم موجود تھے اور کم عمر لڑکوں میں کیونکہ عقل کی کمی ہوتی ہے اُن سے جو بھی پیار محبت سے بولا اُسی کے دوست ہو گئے چنانچہ میرا بھی یہی حال ہوا کہ جب کبھی ماسٹر صاحب نے ڈانٹا تو میں بھی دینتھ گیا جس کا نتیجہ آپس کا خلفشار اور میری بدبختی کی شکل میں ظاہر ہوا میں خود بھی ایسا تھا کہ بزرگوں پر ناز کرتا اور اپنی قسمت پر شاد رہتا تھا، گنڈے تعویذ کی مدد سے پاس ہونے کی امید کرتا، وقت کو لہو ولعب اور قصہ کہانی سُننے میں صرف کرتا میرا کام ہو گیا پھر ایک زمانہ جلد وہ آگیا کہ ترکوں اور عیسائیوں میں جنگ چھڑ گئی بس پھر کیا تھا لوگوں کو پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آگیا اِدھر میری بھی دبی ہوئی آگ دہکنے لگی اور تعلیم کی طرف سے لاپرواہی کیونکہ انگریزی ہمارے دشمنوں کی زبان تھی، اخبار بینی اپنا شعار ہو گیا، کتابیں لے کر اسکول تو چلے جاتے تھے مگر بے توجہی کے ساتھ جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہوتا لیکن تربیت والدہ کے ہاتھ میں تھی جو کامیابی کے ساتھ جاری رہی اور تعلیم میرے ذوق و شوق پر منحصر تھی وہ چوپٹ ہوئی۔ کیونکہ میں بچپن سے شریر اور غضبناک تھا لڑکے تو بھ

لڑکے تھے ماسٹروں سے بھی نہ دبتا تھا ہمارے ماسٹر پربھی سنگھ آنجہانی کہا کرتے تھے کہ خانصاحب اپریل کا بھی کچھ خیال ہے (اس مہینے میں امتحانات ہوتے تھے) وہ بے چارے ہمیشہ میرا خیال رکھتے تھے اور میں تھا کہ "پرواہ نہ باشد"۔

اب میں جب کبھی خیال کرتا ہوں تو میرا دل دُکھ میں ڈوب جاتا ہے کہ میں کسی سے کچھ کم نہ تھا لیکن افسوس کہ تعلیم میں پیچھے رہ گیا۔ میں جب چھٹے درجے میں تھا تو جومیٹری کو صرف چھ گھنٹے میں پورا یاد کر کے صبح کو چھ۶ میں سے پانچ سوال حل کئے تھے جبکہ ایک دن قبل جومیٹری کی ایک لائن بھی یاد نہ تھی۔ خیر آج میں یہ تمام اپنے حالات آنے والے بچّوں کے لئے چھوڑے جاتا ہوں کہ کن کن واقعات کا مجھے سامنا کرنا پڑا اور تکمیل تعلیم میں کون کون سی باتیں حارج ہوئیں اس پر وہ غور کریں اور اُن سے گریز کریں میرا غم کرنا اب فضول ہے۔

مجھے جب اپنے بچپن کی یاد آتی ہے اور اُس زمانے کے واقعات جب ذہن میں آتے ہیں تو ہنسی آ جاتی ہے کیونکہ بچپن سے ہی میں مارشل اسپرٹ لئے ہوئے پیدا ہوا تھا مجھے اگر میلے سے کسی چیز کے لانے کا شوق ہوتا تھا تو وہ ٹین کی تلوار ہوتی تھی ایک مرتبہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میاں مجھے آپ ایک تلوار لا دیں اُنہوں نے جواب دیا کہ بیٹا تم سے کوئی چھین لے گا اس پر جواب دیا کہ آپ چاندی کی تلوار نہ لائیں لوہے کی تلوار لا دیں اُسے کوئی نہ چھینے گا اس بات پر میری والدہ اور والد بے تحاشا ہنسنے لگے اور کہا اچھا۔ وہ جب تک زندہ رہے میرا یہ تقاضا اُن سے ہوتا رہا

اُس زمانے میں تلوار پر لائسنس تھا مجھے اپنی زندگی کا یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا اور اس سوال و جواب سے لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کتنا بڑا تھا۔

چنانچہ یہی اسپرٹ میں اپنے بھتیجے بھتیجی میں بھی پاتا ہوں کہ وہ میلے سے بجائے گیند وغیرہ کے طمنچہ اور چاقو خریدتے ہیں خدا اُن میں یہ اسپرٹ قائم رکھے اور انہیں اعلیٰ تعلیم سے ہمکنار کرے یہ بچپن کے حالات میری ماں اور بھائیوں سے معلوم ہو سکتے ہیں اور وہ اس میں کچھ اضافہ بھی کر سکتے ہیں میں جیسا لڑاکو تھا ویسا ہی فیاض بھی تھا کہ اپنی ماں کا دودھ دوسرے بچوں کو بھی پلوا دیتا تھا یہ بات میری ماں بھی بتا دیں گی۔

میرا اسکول اور میری مایوس زندگی

میں اسکول جاتا تھا وہاں میرے بہت دوست تھے اور میں بھی دوسروں کا دوست تھا مگر یہ اسکول انگریزی تھا وہاں میری مارشل اسپرٹ کا نتیجہ مسٹر منوہر لال جوتشی تھے۔ خدا نے دو ایک واقعات سے صاف بچایا پھر میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا مگر اس زمانۂ طالب علمی کا مجھے سب سے زیادہ شکوہ آج بھی اس پھانسی کی کوٹھری میں بند ہونے پر ایک اور محض دوست سے ہے جس کو میں دل و جان سے زیادہ محبت کرتا تھا جس کے لئے میں دنیا و ما فیہا سے قطعی بے خبر تھا جو کہ میرا دین و ایمان تھا بلکہ سب کچھ تھا۔ بھائی کی طرح پیارا۔ دوستوں کے دائرے میں سب سے افضل، مگر اس نے مجھے ہمیشہ دکھ پر دکھ اور تکلیف پر تکلیف دی میں اُن کا نام نہ لکھوں گا جاننے والے جانتے ہوں گے

پڑھنے والے سمجھ جائیں گے وہ خود جان جائیں گے وہ خود سمجھ جائیں گے میں یہ قصہ نظرانداز کر جاتا مگر مجھے اس ضمن میں آگے لکھنا ہے اس لئے اس کا لکھنا ضروری سمجھا۔ خدا اُن کا بھلا کرے انہیں پروان چڑھائے، بال بچوں میں خوش رکھے۔ مجھے جو بھی مایوسیاں اُٹھانی پڑیں اور میری تعلیم میں نقصان پہنچانے کا باعث ہوئیں وہ میرے انہیں کرم فرماؤں کی کرم فرمائیاں تھیں اور ان تمام باتوں نے مجھے کسی قابل نہ بنایا گو کہ وہ خود میری ہی طرح رہے مگر وہ پھر بھی مزے میں ہیں کیونکہ وہ محض اپنی خدمت کرنا جانتے ہیں اور میں دوسروں کے لئے کچھ بھی کرنے کا خواہشمند تھا اور میں بہت مشکور ہوں کہ مجھے ریوولیشنری ان تمام باتوں ہی نے بنایا اور میں نے جہاں تک تجربہ کیا میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ایسے ہی واقعات اور حادثات انسان کو موت سے بے خوف بنا دیتے ہیں جس کے دل میں محبّت کا مادہ ہوگا وہی دلیش کے لئے وطنی بھائیوں کے لئے سب کچھ کر گذرے گا۔ مسئلہ تصوّف میں عشق مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے میں نے تو ایسا ہی پایا میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ محبّت کا مادّہ ہے جو وطن کی طرف رجوع ہو گیا اور میں موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں فخریہ کہوں گا کہ میں اور وہ دوست مثل بھائی کے تھے میں اس سے حقیقی بھائی جیسا پیار کرتا تھا اور وہ مجھ سے سوتیلے بھائی کی طرح پیش آتا تھا (اگر اس سلسلہ میں کسی کو کچھ لکھنا ہو تو عنائت اللہ، ارشاد حسین و سرور حسین امداد کر سکتے ہیں) اور اگر ضرورت نہ ہو تو نہ لکھا جائے۔ مجھے بچّوں کو نصیحت مقصود ہے کہ ان کو کس دور میں گذرنا ہے اور کن مصائب کا مقابلہ کرنا ہے طالب علمی کی زندگی نہایت خطرناک ہے اس میں احتیاط کرنا ضروری و لابدی ہے۔

جذباتِ اتحادِ اسلامی

جب یورپ کی فضا طرابلس کے ارد گرد عیسائیت کا طوفان اٹھ رہا تھا، جب خلافت کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے کے لئے یورپ کے تثلیث پرست جمع ہو رہے تھے، جب آلِ عثمان کے کمزور و نحیف جسم کے چاروں طرف عیسائی زاغ و زغن مجتمع ہو رہے تھے، جب یورپی چودھری کبھی آرمینیا اور کبھی بلغاریہ و سرویا والوں کو اٹلی سامانِ حرب پہنچا پہنچا کر اشتعال دے رہا تھا کہ جو پاؤ لے لو، جو ملے اسے نہ چھوڑو، معصوم ترکوں کا خون تمہارے لئے حلال ہے، اٹلی طرابلس کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے وہاں روزانہ نت نئے مظالم ڈھائے جانے لگے ہیں اسوقت ایک درد بھری آواز کی پکار ساحل مغرب سے بلند ہوئی ہے جب وہ دیواروں سے ٹکرائی ہے تو اُس کی آواز بازگشت ہندوستان میں سنائی دیتی ہے محض وادیٔ نیل کے مسلمان ہی اس سے بے چین نہیں ہوتے گنگ وجمن کے دوآبہ کے کلمہ گو مسلمان بھی اور بلادِ ہند کے کلمہ "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ" پڑھنے والے متحیر ہو جاتے ہیں کہ یہ آواز تو ہم جیسی ہے اور لہجہ دوسرا ہے۔ وہ بھی لبیک کہتے ہیں اور خدا کے شیر یہاں بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اگر وہاں انور و شکری دست حق پرست میں تلوار لے کر میدان میں کود پڑتے ہیں تو ادھر بھی اہلِ دل گردن میں جھولیاں ڈال در در کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور

روپیہ سے اُن کا خزانہ پُر کر دیتے تھے میں یوں باہمی اخوت اور اتحادِ اسلامی کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور بھولا ہوا وعدہ یاد آجاتا ہے۔ کھوئی ہوئی منزل دکھائی پڑنے لگتی ہے۔ بھائی بھائی ملتے ہیں۔ پروپیگنڈہ ہوتا ہے جس کا اثر نوجوان مسلمانوں پر پڑتا ہے کہ اٹلی (جو اس وقت سخت ترین دشمن تھا) کا مال جلادیا جاتا ہے اور اُس کے خلاف شورش پیدا کی جاتی ہے۔ ترکی خواتین کی حُب الوطنی، نوجوان ترکوں کی سرفروشیاں طلبار کی قربانیاں ایک نئی اسپرٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ میری والدہ جو باقاعدہ تعلیم یافتہ تھیں اخبار کی خریدار مستقل طور پر بن گئیں اور اس طرح میں بھی اخبار پڑھنے لگا اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ مسلمان اور بھی کہیں ہیں کیونکہ اس وقت میں جغرافیہ سے ناواقف تھا اور محض ہندوستان ہی کو مکمل دُنیا سمجھتا تھا جیسے مینڈک کنوئیں کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ میں پٹھان تھا اور یہ قوم عام طور پر جاہل خیال کی جاتی ہے گو میں اب ایسا نہیں ہوں اِن خیالات میں ڈوب گیا اور روز و شب یہی دُعائیں کرتا کہ ترک ہندوستان فتح کر لیں اور یہاں بادشاہ بن جائیں تو ہم خلیفۂ وقت کی رعایا بن جائیں گے اور اگر افغانستان نے حکومت قائم کر لی تو گیا ہے بہتر بھی ہم حقدار ہیں۔ انگریزوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ یہی بانی فساد ہیں اور ان کی حکومت نیست و نابود ہونی چاہیئے اور یہ اس طرح ہو کہ افغانستانی یا ترک لوگ حملہ کر دیں، اور ہم بغاوت کریں اور اس طرح انگریزوں کی سلطنت درہم برہم ہو جائے تم جائے عیسائیوں کی رعایا کے مسلمانوں ہی کی رعایا بن جائیں اور عیسائی سلطنت خراب و خستہ ہو جائے

ممکن ہے بعض ہندوؤں کے بھی ایسے ہی خیالات ہوں کہ چین، جاپان میں سے کوئی ایک
یہاں آجائے تو بہت اچھا ہے گو کہ بنگال میں قربان گاہِ وطن پر قربانیاں چڑھانی شروع ہو
گئی تھیں جس کے قصے میں سنا کرتا تھا مگر ویسے ہی رنگ آمیزی کے ساتھ جیسے ہمارے
قصے اور ہمارے کیس کے واقعات دوسروں کی زبانوں پر آج ہیں۔ بہر حال میرا اُس
وقت کا خیال آج مجھے بہت ذلیل معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک کا حلقۂ غلامی اُتار کر دوسرے
کا غلامی کا جُوا اپنے کندھوں پر رکھنے میں مسرت سی محسوس کرتے تھے خیر وہ میری نا سمجھی
کا زمانہ تھا ہاں میرا خیال اُس زمانے میں ہندوؤں کے بہت خلاف تھا اور بعد کو اس میں
اور اضافہ ہو گیا کیونکہ ہمارے کرم فرما ایک ماسٹر صاحب تھے جن کا اگر میں نام لوں گا تو انہیں مفت
میں شرمندگی حاصل ہوگی وہ میرے ماسٹر تھے جب میں گورنمنٹ اسکول [illegible]
تو وہ ہندو مسلم میں بہت امتیاز کرتے تھے اب میں کہوں گا کہ اُستاد کا یہ طریق کار کمینہ پن
ہے اور فی الحقیقت اسی قسم کے لوگ ملک و وطن کے دُشمن ہیں۔ مگر آج میرا دل ہندو کے
لئے ویسا ہی کشادہ ہے جیسا کہ ایک مسلمان کے لئے۔ خیر اس وقت کے لیڈر آج بھی
اتحادِ اسلامی پر عمل کرتے ہیں گو کہ ایک حد تک میں بھی اُن سے اتفاق کرتا ہوں۔ بھائی
سمجھنے میں کوئی نقصان نہیں مدد کرنا ہمارا فرض ہے کیونکہ ہم بحیثیت ملک کے فیاض باشندے ہیں لیکن
کسی کی حکومت اپنے اوپر قبول کرنا پست ہمتی اور بدبختی ہے یہ کسی طرح ہمارے
شایانِ شان نہیں۔

دُنیا میں انقلاب و تغیرات کتنی تیزی سے ہوا کرتے ہیں۔ کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں

کل میں ترکوں کی حکومت اپنے اوپر باعثِ صد ناز و افتخار اور ذریعۂ بخشش سمجھتا تھا اور آج بد ترین ذلت ۔ آج میں ہر بدیشی حکومت کو بُرا سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی ایسی جمہوری حکومت کو بھی جس میں کمزوروں کا حق حق نہ سمجھا جائیگا جو حکومت سرمایہ داروں اور زمینداروں کے دماغوں کا نتیجہ ہو یا جس میں مزدوروں اور کسانوں کا مساوی حصّہ نہ ہو یا باہم امتیاز و تفریق رکھ کر حکومت کے قوانین بنائے جائیں ۔ میں تو کہوں گا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوا اور بجائے ہمارے گورے آقاؤں کے ہمارے وطنی بھائی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں اور امیر و غریب زمیندار اور کاشتکار میں تفریق و تمیز باقی رہے تو اے خُدا مجھے ایسی آزادی اُسوقت تک نہ دینا جب تک تیری مخلوق میں مساوات قائم نہ ہو جائے ۔ میرے ان خیالات سے مجھے اگر اشترا کی یا کمیونسٹ سمجھا جائے تو مجھے اس کی فکر نہیں ۔

میرا خُدا پر بھروسہ ہے میں اُسے مانتا ہوں وہ سب کو ایک ہی صورت میں پیدا کرتا ہے اور ایک ہی صورت پر مارتا ہے اُس کے خوانِ کرم سے سب کو کھانے کے لئے ملتا ہے ۔ بدمعاش بدمعاشی سے ، لٹیرا لُوٹ سے ، ظالم ظلم سے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ وکیل موکلوں سے زمیندار کسانوں سے اور سرمایہ دار مزدوروں سے جونک کی طرح چمٹ کر اُن کا خون چُوستے ہیں کیونکہ وہ کمزور اور نربل ہیں اِس لئے لٹ جاتے ہیں ۔ یہ سب قانونِ خداوندی کے خلاف ہے اس کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے اُس کے خلاف جنگ فرض ہے ۔ غرضیکہ میرا مطلب مختصراً نوٹ لکھنا ہے ، دیکھئے کل کیا ہو اپنی رائے

اگر موقع ملا تو تفصیل کے ساتھ بعد میں لکھوں گا۔ اچھا تو میں اتحاد اسلامی کا موید ایک عرصہ تک رہا۔

مگر یہ زمانہ وہ تھا جب مجھے زندگی کا شعور حاصل نہیں ہوا تھا یہ زمانہ اس زمانے کے قریب کا ہے جب خودی رام بوس اور کنہائی لال دت نے اپنی قربانی سے بنگال کو ہلا ڈالا تھا اور جس سے تمام ہندوستان کانپ اٹھا تھا۔ کبھی کبھی کہانیاں سننے میں آتی تھیں اور بنگالی بموں کا حال سنتے تھے تو دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ہم بھی ایسے ہوتے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن ہم بھی خودی رام بوس اور کنہائی لال دت کی طرح پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہوں گے اور ہمارا تذکرہ بھی طلباء میں اس طرح ہوگا جس طرح ہم لوگ اُن کا ذکر کیا کرتے تھے اور پھر کیا معلوم کہ ہمارا ذکر کرنے والے بھی اسی طرح اس کوٹھڑی کو آباد کریں۔

ایک دن میں اسکول جارہا تھا کہ یکایک سنا کہ دہلی میں وائسرائے صاحب بہادر پر کسی نے بم مار دیا اور اسکول بند ہو گیا یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی چلو ایک نتیجہ دو کاج چھٹی ملی اور ایک نیا واقعہ بھی ظہور میں آگیا۔ اس کے بعد بازاروں میں خوب گپیں سنیں جیسی کہ اب ہم پر باہر ہوتی ہیں آپ مہاتما شری داس بہاری بوس کی کیفیت سے بخوبی واقف ہوں گے میں بھی واقعات سمجھنے کے قابل تھا اور وہ جگہ بھی دیکھی جہاں وہ ایام فراری میں رہتے تھے۔ خیر وہ کامیاب ہو کر باہر نکل گئے اور ہم کوٹھڑی میں بند ہیں۔

دُعا

اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی

(از انڈمنڈ سیل (جیل میں تحریر کردہ قلمی کتاب سے)

اے خداوندِ قدوس! اے دو جہاں کے مالک؟ اے کائنات پر حکومت کرنے والے؟ اے صاحبِ جبروت بادشاہ؟ اے حی القیوم اے ذوالجلال والاکرام؟ اے ستارالعیوب؟ اے غفار الذنوب؟ تیری حمد وثنا کرنے کے لئے تیرا گناہگار، سیہ کار بندہ جس نے اپنی زندگی کے ۲۸ سال غفلت اور کبر و غرور میں گذار دئے وہ تجھ سے بھٹکا ہوا پھرا۔ جس نے تیری شانِ معبودیت کو نظر انداز کر کے اپنے کو تیرا بندہ نہ سمجھا جو ہمیشہ عیش و عشرت کو، اچھا کھانے کو، اچھا پہننے کو ہی زندگی کا جزو اعظم قرار دیتا رہا جس کی جبینِ نیاز تیری بے نیازی کی چوکھٹ پر نہ جھکی جو حرص و ہوا کا شکار رہا جو شیطانِ ملعون کا گوئے و چوگاں بنا رہا جس نے اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو لہو و لعب میں گذار دیا جس نے دُنیا کی سیہ کاریوں بدکاریوں اور گناہوں کا رکارڈ (beat) کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور کیا نفس کا غلام بنا رہا اور قصہ مختصر یہ کہ اے مالکِ بحر و بر؟ تجھ سے پوشیدہ نہیں

تو ہر وقت عالم کی خبر رکھتا ہے نہ تو اونگھتا ہے نہ تو سوتا ہے۔ آسمان و زمین کا جو بھی خلا ہے وہ تیری نظر کے سامنے ہے اور جو کچھ آسمانوں سے اوپر اور زمین کے نیچے تحت الثریٰ تک ہے سب سے تو واقف ہے اس سے بھی زیادہ واقف جتنا کہ میں جانتا ہوں کہ میں پھانسی کی کوٹھڑی میں بیٹھا تجھ سے تحریر کے ذریعہ سے یا تقریر کے ذریعہ سے اقرار گناہ سے تجھے باخبر کرنے کے لئے نہیں کیونکہ تو تو پہلے سے واقف ہے لیکن میں یوں لکھ رہا ہوں کہ جب تک یہ کاغذ اور روشنائی کا رنگ قائم رہے۔ جس کے ہاتھ میں پہنچے وہ یہ سمجھ لے کہ اشفاق خدا کا گنہگار اور سیہ کار تھا لیس اس کے لئے دعائے مغفرت کرے میں ایک فردِ گناہ ہوں مجسم معصیت ہوں۔

اے میرے معبود! میری غرض نام و نمود نہیں ہے مصنف یا ناصح نہیں بننا چاہتا میرا مقصد اس مختصر سی کتاب لکھنے سے جو ہے وہ تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے تو مجھے موقع دے تو مجھے اس وقت تک زندہ اور امن میں رکھ جب تک یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب اپیل خارج ہوئی تھی اور رحم کی درخواست مسترد ہو گئی تھی اور ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۲۷ء پھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی چار روز میرے پھانسی دیے جانے میں باقی رہ گئے تھے سب انتظامات پورے ہو گئے تھے۔ جلاد آ گیا تھا اُس وقت کی پریشانی تجھ پر خوب روشن ہے کیا میں موت سے ڈر رہا تھا کیا مجھے یہ خیال تھا کہ ہر چیز مجھ سے چھٹ جائے گی اور یہاں پھر آنا نہ ہو گا۔ کیا مجھے دوست، احباب، اعزاء و اقربا کی یاد ستا رہی تھی۔ نہیں میرے مالک نہیں۔ نہیں میرے آقا ایسی بات

نہیں ہے۔ مجھے دُکھ دِس بات کا تھا تکلیف اس بات کی تھی کہ تیری جناب میں کیا جواب دُوں گا۔

اے مالکِ ہر دو جہاں تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہُوں کہ تو میری مدد فرما کہ میں کچھ لکھ سکوں میرا علم محدود ہے مگر تیرا علم دسیع ہے کہ کُل کائینات کا احاطہ کئے ہُوئے ہے جس طرح سُورج کی روشنی سے ذرّے چمک اُٹھتے ہیں تو مُیرے بھی ذرۂ علم کو اپنے آفتابِ عِلم سے روشن کر دے تاکہ میرے بعد میری یہ ناچیز تحریر جب میرے گھر کے لوگوں کو ملے اور میرے وطنی بھائی دیکھیں اور اِس پر عمل کریں۔ بعد اس کے تیرا اشفاق کاکوری کیس کا پھانسی والا قیدی تجھ سے تیری رضا چاہتا ہے، تجھ سے تیری محبت چاہتا ہے۔ تیرا کرم چاہتا ہے، تو اس کی بدکاریوں کو نکوکاریوں سے بدل دے اور اِس سے راضی ہو جا خداوندا! تیری جناب میں اشفاق دامن پھیلائے کھڑا ہے۔ اِس کا دامن بھر دے تیری درگاہ سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا پھر کیا تو اُسے خالی ہاتھ لوٹائے گا۔ کیا وہ پُر امید تیری جناب میں آ کر ناامید لوٹے نہیں جو تجھ سے طلب کرتا ہے تو اُسے دیتا ہے، جو تجھے ڈھونڈتا ہے تو اُسے مِلتا ہے بس اس کو روتی ہوئی آنکھ اور دُکھتا ہُوا دل عطا فرما اور اس کو قبول فرما۔ گناہ کس کے کئے، نافرمانی کس کی کی۔ بھٹک کر کس سے چلا، کیا کوئی اس کا دوسرا معبود ہے کیا تو اس کا خدا نہیں ہے تیرے گناہ کئے۔ تیری نافرمانی کی، تجھ سے بھٹک کر چلا، تو ہی اس کا معبود ہے۔ تو ہی اس کا خدا ہے نہیں تو تو کریم و رحیم ہے تو غفار الذنوب ہے۔ ستار العیوب ہے تو معاف کرے گا۔

اگر تیرے دربار سے نا اُمید لوٹے تو پھر تو ہی بتا کہاں جائے ؂

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

چھپا لے دامنِ رحمت میں ان گناہوں کو ۔ الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کریں نہ عدو دیکھ کر ذلیل ہمیں ۔ کہ جس کے بندے ہیں اُس کو کریم کہتے ہیں

تیرے کرم کی اُمید پر اشفاق پھانسی لگنے کے انتظار میں خوش خوش بیٹھا ہے اور کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔

نقش زیبائے تو آورد مرا بر درِ تو
فارغم کرد ز نقشِ در و دیوارِ دگر